رسائل و مسائل

نظامِ اسلامی میں نزاعی امور کے فیصلہ کا صحیح طریقہ

سوال: قرآن مجید میں ارشاد ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا۔ (اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اُن لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریقِ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے)۔

اس آیت کی تفسیر میں آپ نے تفہیم القرآن میں فرمایا ہے: "وہ بات جو آیت زیرِ بحث میں مستقل اور قطعی اصول کے طور پر طے کر دی گئی ہے یہ ہے کہ اسلامی نظام میں خدا کا حکم اور رسول کا طریقہ بنیادی قانون اور آخری سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے درمیان یا حکومت اور رعایا کے درمیان جس مسئلہ پر بھی نزاع واقع ہو گی اس میں فیصلہ کے لیے قرآن اور سنت کی طرف رجوع کیا جائے گا اور جو فیصلہ وہاں سے حاصل ہو گا اس کے سامنے سب سرِ تسلیم خم کر دیں گے۔ اس طرح تمام مسائلِ زندگی میں کتاب اللہ و سنتِ رسول اللہ کو سند اور مرجع اور حرفِ آخر تسلیم کرنا اسلامی نظام کی وہ لازمی خصوصیت ہے جو اسے کافرانہ نظامِ زندگی سے ممیز کرتی ہے۔"

آپ کی اس تشریح سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ سارے نزاعی امور میں آخری اور فیصلہ کن چیز اللہ اور اُس کے رسول کے احکام ہیں۔ اس ضمن میں ایک الجھن یہ پیش آتی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں تو یہ بالکل ممکن تھا کہ جس وقت کوئی اختلاف رائے

ہوتا اُسی وقت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کر لیا، لیکن اب جبکہ حضور ہمارے درمیان موجود نہیں بلکہ صرف اُن کی تعلیمات ہمارے سامنے ہیں، اس وقت اگر اسلام کے کسی حکم کی تعبیر کا مسئلہ درپیش ہو تو ایک اسلامی نظام میں کس شخص یا ادارہ کو اس امر کا فیصلہ کرنے کا آخری اختیار حاصل ہوگا کہ اس باب میں منشائے شریعت کیا ہے۔ امید ہے آپ اس معاملہ میں رہنمائی فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

جواب:- اس سوال میں جس الجھن کا ذکر کیا گیا ہے اس کو رفع کرنے میں قرآن، سنت، دورِ صحابہ کا تعامل، عقلِ عام، اور دنیا کا معروف طریقِ کار، سب مِل جُل کر ہماری مدد کرتے ہیں۔ سب سے پہلے قرآن کو دیکھیے۔ وہ اس معاملہ میں تین اصولی ہدایات دیتا ہے:-

اوّل یہ کہ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ "اگر تم علم نہیں رکھتے تو اہل الذکر سے پوچھ لو" (النحل رکوع ۶ - الانبیاء رکوع ۱)- اس آیت میں "اہل الذکر" کا لفظ بہت معنی خیز ہے۔ "ذکر" کا لفظ قرآن کی اصطلاح میں مخصوص طور پر اُس سبق کے لیے استعمال ہوا ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے کسی امت کو دیا ہو، اور اہل الذکر صرف وہ لوگ ہیں جنہیں یہ سبق یاد ہو۔ اس لفظ سے محض علم (KNOWLEDGE) مراد نہیں لیا جا سکتا، بلکہ اس کا اطلاق لازماً علم کتاب و سنت ہی پر ہو سکتا ہے۔ لہٰذا یہ آیت فیصلہ کرتی ہے کہ معاشرے میں مرجعیت کا مقام اُن لوگوں کو حاصل ہونا چاہیے جو کتاب الٰہی کا علم رکھتے ہوں اور اُس طریقے سے باخبر ہوں جس پر چلنے کی تعلیم اللہ کے رسول نے دی ہے۔

دوم یہ کہ وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ۭ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ "اور جب کبھی امن یا خوف سے تعلق رکھنے والا کوئی اہم معاملہ ان کو پیش آتا ہے تو وہ اس کو پھیلا دیتے ہیں، حالانکہ اگر وہ اس کو رسول تک اور اپنے اولی الامر تک پہنچاتے تو اس کی کنہ جان لیتے وہ لوگ جو ان کے درمیان اس کی کنہ نکال لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں" (النساء۔ رکوع ۱۱)- اس سے معلوم ہوا کہ معاشرے کو پیش آنے

والے اہم معاملات میں، خواہ وہ امن کی حالت سے تعلق رکھتے ہوں یا جنگ کی حالت سے، غیر اندیشناک نوعیت کے ہوں یا اندیشناک نوعیت کے، ان میں صرف وہی لوگ مرجع ہو سکتے ہیں جو مسلمانوں کے درمیان اولی الامر ہوں، یعنی جن پر اجتماعی معاملات کو چلانے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہو، اور جو "استنباط" کی صلاحیت رکھتے ہوں، یعنی پیش آمدہ معاملے کی حقیقت بھی معلوم کر سکتے ہوں اور کتاب اللہ و طریقِ رسول اللہ سے بھی دریافت کر سکتے ہوں کہ اس طرح کی صورت حال میں کیا کرنا چاہیے۔ یہ آیت اجتماعی مہمات اور معاشرے کے لیے اہمیت رکھنے والے معاملات میں عام اہل الذکر کے بجائے ان لوگوں کو مرجع قرار دیتی ہے جو اولی الامر ہوں۔ لیکن بہرحال ان کو بھی ہونا چاہیے اہل الذکر ہی میں سے، کیونکہ وہی اس قابل ہو سکتے ہیں کہ جس قضیے سے ان کو سابقہ پڑا ہے اس میں خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی دی ہوئی قولی و عملی ہدایات کو نگاہ میں رکھ کر صحیح رائے قائم کر سکیں۔

سوم یہ کہ اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ "ان کا کام آپس کے مشورے سے ہوتا ہے" (الشوریٰ رکوع ۴)۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کا آخری فیصلہ کس طرح ہونا چاہیے۔

ان تین اصولوں کو جمع کر کے دیکھا جائے تو تمام نزاعات میں فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ کا منشا پورا کرنے کی عملی صورت یہ سامنے آتی ہے کہ لوگوں کو اپنی زندگی میں عموماً جو مسائل پیش آئیں ان میں وہ "اہل الذکر" سے رجوع کریں، اور وہ انہیں بتائیں کہ ان معاملات میں خدا اور رسول کا حکم کیا ہے۔ رہے مملکت اور معاشرے کے لیے اہمیت رکھنے والے مسائل، تو وہ اولی الامر کے سامنے لائے جائیں اور وہ باہمی مشاورت سے یہ تحقیق کرنے کی کوشش کریں کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی رو سے کیا چیز زیادہ سے زیادہ قرینِ حق و صواب ہے۔

اب دیکھیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں، اور حضور کے بعد خلافت راشدہ کے دور میں عملدرآمد کیا تھا۔ حضور کی حیات طیبہ میں جو معاملات براہِ راست آپ تک پہنچتے تھے ان میں تو اللہ اور رسول کا منشا بتانے والے، اور اس کے مطابق نزاعات کا فیصلہ کرنے والے آپ خود تھے۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ پوری مملکتِ اسلامیہ میں پھیلی ہوئی آبادی کو جو معاملات پیش

آتے تھے وہ سب کے سب براہِ راست حضور ہی تک نہیں پہنچائے جاتے تھے اور نہ آپ ہی سے شخصاً ان کا فیصلہ حاصل کیا جاتا تھا۔ اس کے بجائے مملکت کے مختلف علاقوں میں آپ کی طرف سے معلّمین مامور تھے جو لوگوں کو دین سکھاتے تھے اور عام لوگ اپنے روزمرّہ کے معاملات میں انہی سے معلوم کرتے تھے کہ کتاب اللہ کا حکم کیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طریقے کی تعلیم دی ہے۔ اس کے علاوہ ہر علاقے میں امیر، عامل، اور قاضی مقرر تھے جو اپنے اپنے دائرۂ عمل سے تعلق رکھنے والے اکثر و بیشتر معاملات کے خود فیصلے کیا کرتے تھے۔ ان لوگوں کے لیے فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ کا منشا پورا کرنے کا جو طریقہ حضور نے خود پسند فرمایا تھا وہ حضرت مُعاذ بن جَبل کی مشہور حدیث میں بیان ہوا ہے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعث معاذاً الی الیمن فقال کیف تقضی قال اقضی بما فی کتاب اللہ، قال فان لم یکن فی کتاب اللہ قال فبسنة رسول اللہ، قال فان لم یکن فی سنة رسول اللہ، قال اجتهد رائي، قال الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ۔ (ترمذی، ابواب الاحکام۔ ابوداؤد، کتاب الاقضیہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب معاذ بن جبل کو یمن کی طرف قاضی بنا کر روانہ کیا تو ان سے پوچھا تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟ انہوں نے عرض کیا اُس ہدایت کے مطابق جو اللہ کی کتاب میں ہے۔ فرمایا اگر کتاب اللہ میں نہ ملے۔ عرض کیا پھر جو سنت رسول اللہ میں ہو۔ فرمایا اگر سنت رسول اللہ میں بھی نہ ملے۔ عرض کیا میں اپنی رائے سے (حق و صواب تک پہنچنے کی) پوری کوشش کروں گا۔ اس پر حضور نے فرمایا شکر ہے اس خدا کا جس نے رسول اللہ کے فرستادہ شخص کو وہ طریقہ اختیار کرنے کی توفیق دی جو رسول اللہ کو پسند ہے۔

حضور نے اپنے عہد مبارک میں شوریٰ کے نظام کی بنا بھی ڈال دی تھی اور ہر ایسے معاملے میں جس کے متعلق آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی خاص حکم نہ ملا ہو، آپ معاشرے کے اہل الرائے لوگوں سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ اس کی ایک نمایاں مثال وہ مشاورت ہے جو آنحضور نے اس مسئلے پر

فرمائی تھی کہ لوگوں کو نماز کے اوقات پر جمع کرنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے، اور جس کے نتیجے میں بالآخر اذان کا طریقہ آپ نے مقرر فرمایا۔

قریب قریب یہی طریقِ کار عہدِ رسالت کے بعد خلافتِ راشدہ میں جاری رہا۔ فرق صرف یہ تھا کہ عہدِ رسالت میں حضور خود موجود تھے اس لیے معاملات کا آخری فیصلہ آپ سے شخصاً حاصل کیا جا سکتا تھا، اور بعد کے دور میں مرجع آپ کی ذات نہ رہی بلکہ وہ روایات ہو گئیں جو آپ کی سنت کے متعلق لوگوں کے پاس محفوظ تھیں۔ اس دور میں تین ادارے الگ الگ پائے جاتے تھے جو اپنے اپنے مقام و موقف کے لحاظ سے فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ کا منشا پورا کرتے تھے۔

(۱) عام اہلِ علم جو کتاب اللہ کو جانتے تھے اور جن کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں یا حضور کے طریقِ عمل یا حضور کی تقریر[1] کے بارے میں کوئی علم موجود تھا۔ ان سے صرف عوام الناس ہی اپنی زندگی کے معاملات میں فتوے نہیں لیتے تھے بلکہ خود خلفائے راشدین کو بھی جب کسی مسئلے کا فیصلہ کرنے میں یہ معلوم کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی کہ حضور نے اس کے بارے میں کوئی حکم دیا ہے یا نہیں، تو انہی لوگوں کی طرف رجوع فرمایا کرتے تھے۔ بارہا ایسا بھی ہوا ہے کہ خلیفۂ وقت نے علم نہ ہونے کی وجہ سے ایک مسئلے کا فیصلہ اپنی رائے سے کر دیا ہے اور بعد میں جب معلوم ہوا ہے کہ اس معاملہ میں کوئی دوسری بات حضور سے ثابت ہے تو اس فیصلے کو بدل دیا ہے۔ ان اہلِ علم کی موجودگی کا فائدہ صرف یہی نہ تھا کہ فرداً فرداً وہ عوام اور اولی الامر کے لیے ایک ذریعۂ علم کا کام دیتے تھے، بلکہ اس سے بڑھ کر ان کا عظیم تر فائدہ یہ تھا کہ مجموعی طور پر وہ اس بات کی ضمانت تھے کہ کوئی عدالت اور کوئی حکومت اور کوئی مجلسِ شوریٰ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے خلاف فیصلہ نہ کر سکے۔ ان کی مضبوط رائے عام نظامِ اسلامی کی پشت پناہ تھی۔ ہر غلط فیصلے کو ٹوکنے کے لیے ان کا چوکنا رہنا نظام کے صحیح چلنے کا ضامن تھا۔ کسی مسئلے میں ان کا اتفاق رائے اس بات

[1] تقریر سے مراد یہ ہے کہ حضور کے زمانے میں کوئی عمل کیا گیا ہو اور آپ نے اس کو برقرار رہنے دیا ہو۔

کی دلیل تھا کہ اس مسئلہ خاص میں دین کی راہ متعین ہے جس سے ہٹ کر فیصلہ نہیں کیا جا سکتا ، اور ان کا اختلاف رائے یہ معنی رکھتا تھا کہ اس مسئلے میں دو یا زیادہ اقوال کی گنجائش ہے اگرچہ فیصلہ ایک ہی قول پر ہو چکا ہو۔ ان کی موجودگی میں یہ ممکن نہ تھا کہ امت کے اندر کوئی بدعت قبولِ عام حاصل کر لے جائے ، کیونکہ ہر طرف دین کے جاننے والے لوگ اس پر گرفت کرنے کے لیے موجود تھے۔

(۲) قضاء ، یعنی عدلیہ جس کے ضابطے کی وضاحت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قاضی شریح کے نام اپنے ایک فرمان میں اس طرح کی ہے:

اقض بما فی کتاب الله ، فان لم یکن فی کتاب الله فبسنة رسول الله صلی الله علیه وسلم فان لم یکن فی کتاب الله ولا فی سنة رسول الله صلی الله علیه وسلم فاقض بما قضی به الصالحون فان لم یکن فی کتاب الله ولا فی سنة رسول الله ولم یقض به الصالحون فان شئت فتقدم وان شئت فتأخر ولا اری التأخر الا خیرا لك والسلام علیکم (النسائی، کتاب آداب القضاة)

فیصلہ اس حکم پر کرو جو کتاب اللہ میں ہو، اگر کتاب اللہ میں نہ ہو تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر، اگر نہ کتاب اللہ میں ہو نہ سنت رسول اللہ میں تو پھر صالحین نے جو فیصلے کیے ہوں ان کے مطابق فیصلہ کرو۔ لیکن اگر کسی معاملے کا حکم نہ کتاب اللہ میں ملتا ہو نہ سنت رسول اللہ میں، اور نہ صالحین ہی کے فیصلوں میں اس کے متعلق کوئی نظیر موجود ہو تو تمہیں اختیار ہے چاہے خود پیش قدمی کرو یا رک جاؤ، اور میرے نزدیک رک جانا تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے[1]

اسی ضابطے کو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

قد اتی علینا زمان ولسنا نقضی و

وہ زمانہ گزر چکا ہے جب ہم نہ فیصلہ کرتے تھے اور نہ

---

[1] رک جانے سے دو چیزیں مراد ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ قاضی کچھ دیر اس بات کا انتظار کرے کہ کوئی دوسری عدالت پیش قدمی کر کے اس طرح کے ایک معاملے میں نظیر قائم کرتی ہے یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ قاضی خود فیصلہ کرنے کے بجائے اس معاملہ میں اُس تیسرے ادارے کی طرف رجوع کرے جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

لسنا هنالك ثم ان الله عز وجل قدر علينا ان بلغنا ما ترون فمن عرض له منكم قضاء بعد اليوم فليقض بما في كتاب الله فان جاء امر ليس في كتاب الله فليقض بما قضى به نبيه صلى الله عليه وسلم فان جاء امر ليس في كتاب الله ولا قضى به نبيه صلى الله عليه وسلم فليقض بما قضى به الصالحون فان جاء امر ليس في كتاب الله ولا قضى به نبيه صلى الله عليه وسلم ولا قضى به الصالحون فليجتهد رأيه ولا يقول اني اخاف واني اخاف فان الحلال بين والحرام بين وبين ذالك امور مشتبهات فدع ما يريبك الى مالا يريبك۔

(النسائی، کتاب مذکور)

ہماری یہ حیثیت تھی کہ فیصلے کریں (یعنی سرکار رسالتمآب کا دور) ۔ اب تقدیر الٰہی سے ہم اس حالت کو پہنچے ہیں جو تم لوگ دیکھ رہے ہو۔ پس اب تم میں سے جس کے سامنے کوئی معاملہ فیصلے کے لیے پیش ہو تو اسے چاہیے کہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرے۔ اور اگر ایسا کوئی معاملہ آجائے جس کا حکم کتاب اللہ میں نہ ہو تو اس کا فیصلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کے مطابق کرے اور اگر معاملہ ایسا ہو کہ اس کا حکم نہ کتاب اللہ میں ہو اور نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا فیصلہ فرمایا ہو تو صالحین نے اس کا جو فیصلہ کیا ہو اس کی پیروی کرے۔ لیکن اگر ایک معاملہ ایسا آجائے جو نہ کتاب اللہ میں ہو، نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں میں، اور نہ صالحین نے اس سے پہلے کبھی اس کا فیصلہ کیا ہو تو اپنی رائے سے (حق و صواب تک پہنچنے کی) پوری کوشش کرے اور یہ نہ کہے کہ میں ڈرتا ہوں، میں ڈرتا ہوں۔ کیونکہ حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح (ہے) اور ان دونوں کے درمیان کچھ امور مشتبہ ہیں، سو مشتبہ امور میں آدمی کو وہ فیصلہ کرنا چاہیے جو اس کے ضمیر کو نہ کھٹکے اور ایسا فیصلہ کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے جس کے متعلق خود اس کے ضمیر میں کھٹک ہو۔

یہ عدلیہ صرف عوام ہی کے باہمی نزاعات کا فیصلہ کرنے کی مجاز نہ تھی بلکہ انتظامیہ ( ) کے خلاف بھی وہ لوگوں کے دعاوی سنتی اور ان کے فیصلے کرتی تھی۔ اس کے سامنے حاضر ہونے سے نہ کوئی گورنر مستثنیٰ تھا نہ خود خلیفۂ وقت۔ اسی طرح انتظامیہ کے بڑے سے بڑے شخص، حتیٰ کہ خلیفۂ وقت کو

بھی، اور خود حکومت کو بھی اگر کسی کے خلاف کوئی ذاتی یا سرکاری دعویٰ ہوتا تھا تو اسے عدالت میں جانا ہوتا تھا اور عدالت ہی یہ طے کرتی تھی کہ خدا اور رسول کے قانون کی رو سے اس کا صحیح فیصلہ کیا ہے۔

(۳) اولی الامر یعنی خلیفہ اور اس کی مجلسِ شوریٰ۔ یہ وہ آخری با اختیار ادارہ تھا جو قرآن کی ہدایت کے مطابق باہمی مشورے سے یہ طے کرتا تھا کہ معاشرے اور مملکت کو پیش آنے والے مختلف معاملات میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے کیا حکم ثابت ہے، اور اگر کسی معاملے کا حکم کتاب و سنت میں نہیں ہے تو اس کے بارے میں کونسا طرزِ عمل دین کے اصول اور اس کی روح اور جماعت مسلمین کی مصلحت کے لحاظ سے اقرب الی الصواب ہے۔ اس ادارے کے بکثرت فیصلے احادیث و آثار اور فقہ کی کتابوں میں مستند ذرائع سے نقل ہوئے ہیں، اور اکثر و بیشتر کے ساتھ وہ تفصیلی بحثیں بھی منقول ہوئی ہیں جو فیصلہ کرتے وقت صحابہ کی مجلس میں ہوئی تھیں۔ ان کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادارہ پوری سختی کے ساتھ جس قاعدۂ کلیہ کی پابندی کرتا تھا وہ یہ تھا کہ ہر معاملے میں سب سے پہلے کتاب اللہ کی طرف رجوع کیا جائے، پھر یہ معلوم کیا جائے کہ اگر اس طرح کا کوئی معاملہ حضور کے زمانے میں پیش آیا ہے تو آپ نے اس کے بارے میں کیا فیصلہ فرمایا ہے، اور اپنی صوابدید پر صرف اس صورت میں فیصلہ کیا جائے جب کہ یہ دونوں ماخذِ ہدایت خاموش ہوں۔ جس معاملے میں بھی اللہ کی کتاب سے کوئی آیت یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے کوئی نظیر ان کو مل گئی ہے، اس میں کبھی انہوں نے اس سے ہٹ کر کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ پورے دورِ صحابہ میں اس قاعدے کے خلاف ایک مثال بھی ہم کو نہیں ملتی۔ اگرچہ عملاً مملکت میں آخری فیصلے کے اختیارات اولی الامر ہی کو حاصل تھے، لیکن قانوناً وہ قرآن اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری فیصلہ کن سند تسلیم کرتے تھے، اور مسلم معاشرہ بھی ان کے اقتدار کی اطاعت اسی اطمینان و اعتماد کی بنا پر کرتا تھا کہ وہ اپنے فیصلوں میں قرآن و سنت کی پیروی سے تجاوز نہ کریں گے۔ ان میں سے کسی کے ذہن میں یہ وہم و گمان تک نہ تھا کہ وہ نصِ قرآن کے خلاف کوئی قانون بنانے یا حکم دینے کے مجاز ہیں۔ اسی طرح کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی اس تصور نے کبھی راہ نہیں پائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زمانے کے صاحبِ امر تھے اور ہم اپنے زمانے

کے صاحب امر ہیں، ہم اس کے پابند نہیں ہیں کہ حضورؐ نے اپنے دورِ حکومت میں جو احکام دیئے ہوں ان کے نظائر کی پیروی کریں۔ حضورؐ کی وفات کے بعد خلافت کا ادارہ جس روز وجود میں آیا اسی روز خلیفۂ اوّل نے اپنے خطبے میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ

اطیعونی ما اطعت اللہ و رسولہ فان عصیت اللہ و رسولہ فلا طاعۃ لی علیکم

میری اطاعت کرو جب تک کہ میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا رہوں۔ اور اگر میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو میرے لیے کوئی اطاعت تم پر نہیں ہے۔

اس اعلان سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ خلافت کا یہ ادارہ قائم ہی اس معاہدے پر ہوا تھا کہ خلیفہ خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اور امت خلیفہ کی اطاعت کرے گی۔ دوسرے الفاظ میں امت پر خلیفہ کی اطاعت اس شرط کے ساتھ مشروط تھی کہ وہ خدا اور رسول کے احکام کی پیروی کرے گا۔ اس شرط کے فوت ہوتے ہی امت پر سے خلیفہ کی اطاعت کا فریضہ آپ سے آپ ساقط ہو جاتا تھا۔

اس کے بعد ذرا عقلِ عام سے کام لے کر دیکھیے کہ قرآن مجید کی آیت زیرِ بحث کا منشا کیا ہے اور اس کے تقاضے عملاً کس طرح پورے ہو سکتے ہیں۔ یہ آیت پورے مسلم معاشرے کو خطاب کر کے اسے علی الترتیب تین اطاعتوں کا ملتزم قرار دیتی ہے، پہلے خدا کی، پھر رسول کی، پھر ان اولی الامر کی جو خود اس معاشرے میں سے ہوں۔ اور نزاعات کے بارے میں ہدایت کرتی ہے کہ فیصلے کے لیے خدا اور رسول کی طرف رجوع کرو۔ اس سے آیت کا جو منشا ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ معاشرے پر اصل اطاعت خدا اور رسول کی واجب ہے، اولی الامر کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت کے تابع ہے، نزاع صرف عوام کے درمیان ہی نہیں عوام اور اولی الامر کے درمیان بھی ہو سکتی ہے اور نزاع کی تمام صورتوں میں آخری فیصلہ کن اقتدار اولی الامر کا نہیں بلکہ خدا اور رسول کا ہے، ان کا جو حکم بھی ہو اس کے آگے عوام کو بھی سر جھکا دینا چاہیے اور اولی الامر کو بھی۔

اب پہلا سوال یہ ہے کہ فیصلہ کے لیے خدا اور رسول کی طرف رجوع کرنے کا مطلب کیا ہے؟
ظاہر ہے کہ خدا کی طرف رجوع کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا خود سامنے موجود ہو اور اس کے حضور مقدمہ پیش کر کے فیصلہ حاصل کیا جائے، بلکہ اس سے مراد خدا کی کتاب سے یہ معلوم کرنا ہے کہ معاملہ متنازع فیہ میں اس کا حکم کیا ہے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرنے کا مطلب بھی یہ نہیں ہو سکتا کہ ذاتِ رسولؐ سے براہِ راست رجوع کیا جائے، بلکہ لامحالہ اس کا مطلب بھی یہی ہو سکتا ہے کہ حضور کی تعلیمات اور آپ کے قول و عمل سے ہدایت حاصل کی جائے۔ یہ بات تو خود حضور کی زندگی میں بھی ممکن نہ تھی کہ عدن سے لے کر تبوک تک، اور بحرین سے لے کر جدے تک ساری مملکت اسلامیہ کا ہر باشندہ اپنے ہر معاملے کا فیصلہ براہِ راست حضور ہی سے کراتا ہو۔ اس زمانے میں بھی سنت رسول ہی کو احکام کا ماخذ ہونا چاہیے تھا۔

اس کے بعد دوسرا سوال یہ ہے کہ نزاعات میں خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت سے فیصلہ حاصل کرنے کی صورت کیا ہو سکتی ہے؟ ظاہر بات ہے کہ یہ فیصلہ انسان ہی دینگے، کتاب اور سنت خود تو نہیں بولیں گے۔ لیکن لامحالہ یہ انسان وہی ہونے چاہئیں جن کے پاس کتاب و سنت کا قابلِ اعتماد علم ہو۔ اور کتاب و سنت کی بنیاد پر فیصلہ کرنے والے بہرحال نزاع کے فریقین خود نہیں ہو سکتے، ان کے سوا کوئی تیسرا غیر جانب دار شخص یا ادارہ ایسا ہونا چاہیے جو ان کے درمیان فیصلہ کرے۔ اب یہ بات نزاعات کی نوعیت پر منحصر ہے کہ کس قسم کی نزاع میں فیصلہ دینے کے لیے کون موزوں ہو سکتا ہے۔ ایک قسم کی نزاع ایسی ہے جس کا فیصلہ ہر ذی علم آدمی کر سکتا ہے۔ دوسری قسم کی نزاع لازماً ایک عدالت چاہتی ہے۔ اور بعض نزاعات اپنی نوعیت ہی کے لحاظ سے ایسی ہیں کہ ان کا حتمی فیصلہ اولی الامر کے سوا کوئی اور نہیں کر سکتا۔ مگر ان سب صورتوں میں فیصلے کا ماخذ کتاب و سنت ہی کو ہونا چاہیے۔

یہ وہ بات ہے جو عقلِ عام کی مدد سے آیت کے الفاظ پر غور کر کے ہر شخص سمجھ سکتا ہے بشرطیکہ اس کے ذہن میں کوئی اینچ پینچ نہ ہو۔ اب ایک نظر یہ بھی دیکھ لیجیے کہ دنیا کا معروف طریقہ اس

آیت کے تجویز کردہ نظام اور اس کی عملی صورت کے سمجھنے میں ہماری کیا مدد کرتا ہے۔ دنیا میں آج قانون کی حکومت (RULE OF LAW) کا بڑا چرچا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ دنیا میں انصاف کے قیام کے لیے قانون کی بالاتری ناگزیر ہے جس کے آگے بڑے اور چھوٹے سب یکساں ہوں اور جسے عامی اور حاکم اور خود حکومت پر بے لاگ طریقے سے نافذ کیا جائے۔ اس قانون کو چاہے ایک پارلیمنٹ ہی بنائے، مگر جب وہ قانون بن جائے تو جب تک وہ قانون ہے خود پارلیمنٹ کو بھی اس کی پیروی کرنی چاہیے۔ اس حاکمیتِ قانون کے نظریے کو جہاں بھی عملی جامہ پہنایا گیا ہے وہاں لازماً چار چیزوں کا ہونا ضروری سمجھا گیا ہے:

ایک، ایسا معاشرہ جو قانون کا احترام کرنے والا ہو اور اس کی پیروی کا حقیقی ارادہ رکھتا ہو۔

دوسرے، معاشرے میں بکثرت ایسے لوگوں کا پایا جانا جو قانون کو جانتے ہوں، لوگوں کو قانون کی پیروی میں مدد دے سکتے ہوں، اور جن کا مجموعی علم اور رسوخ واثر اس بات کا ضامن ہو کہ نہ معاشرہ قانون کی راہ سے ہٹ سکے اور نہ سیاسی اقتدار کو اس سے ہٹنے کی جرأت ہو سکے۔

تیسرے، ایک بے لاگ عدلیہ جو عوام اور حکام اور حکومت کی باہمی نزاعات میں قانون کے مطابق ٹھیک ٹھیک فیصلے کرے۔

چوتھے، ایک بلند ترین اختیارات رکھنے والا ادارہ جو معاشرے کو پیش آنے والے تمام مسائل و معاملات کا آخری حل تجویز کرے اور وہی حل معاشرے میں قانون کی حیثیت سے نافذ ہو۔

ان حقائق کو نگاہ میں رکھ کر جب آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ قرآن مجید کی زیر بحث آیت دراصل اسلامی معاشرے میں قانون کی فرمانروائی ہی قائم کرتی ہے، اور اس پر عملدرآمد کے لیے وہی چار چیزیں درکار ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ فرق اگر ہے تو یہ کہ وہ جس قانون کی فرمانروائی قائم کرتی ہے وہ فی الواقع اس کا مستحق ہے، اور دنیا میں جن قوانین کی بالاتری قائم کی جاتی ہے وہ اس کے مستحق نہیں ہیں۔ وہ خدا اور رسول کے قانون کو بالاتر قانون قرار دیتی ہے جس کے آگے سب کو سر تسلیم خم کر دینا چاہیے اور جس کے تابع ہونے میں سب یکساں ہوں۔ اس کا مخاطب ایک ایسا

معاشرہ ہے جو اس قانون پر ایمان لائے اور اپنے قلب و ضمیر کے تقاضے سے اس کی اطاعت کرے۔ اس کا منشا پورا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے میں اہل الذکر کی ایک کثیر تعداد پائی جاتی ہو جن کی مدد سے افراد معاشرہ اپنی زندگی کے معاملات میں ہر جگہ ہر وقت اس بالاتر قانون کی رہنمائی حاصل کرتے رہیں اور جن کے ذریعہ سے رائے عام اس نظام کی حفاظت کے لیے ہمیشہ بیدار رہے۔ اس کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ایک نظام عدالت موجود ہو جو عوام ہی کے درمیان نہیں بلکہ عوام اور ان کے حاکموں کے درمیان بھی بالاتر قانون کے مطابق فیصلے کرے۔ اور وہ اولی الامر کے ایک ایسے ادارے کی طالب بھی ہے جو خود اس بالاتر قانون کا تابع ہو اور معاشرے کی اجتماعی ضروریات کے لیے اس کی تفسیر و تعبیر اور اس کے تحت اجتہاد کے آخری اختیارات استعمال کرے۔

قطبین میں روزہ کے اوقات کا تعین

سوال: قطبین کے علاقوں میں شب و روز کے پیمانے بالکل بدل جاتے ہیں۔ وہاں اگر چھ مہینے دن رہتا ہے تو چھ مہینے رات رہتی ہے۔ ایسے علاقوں میں روزہ کے لیے افطار اور سحری کے اوقات کا تعین کس طرح کیا جائے گا۔ کیا ہر شخص کی اپنی ہمت اور صوابدید پر یہ بات چھوڑ دی جائے گی کہ وہ جتنا طویل روزہ رکھ سکے رکھ لے کہ احکام الٰہی کی تعمیل میں جتنی سعی کی جائے اتنا ہی زیادہ اس کا اجر ہے، یا یہ بہتر ہوگا کہ گھڑی کے لحاظ سے ساری دنیا کے لیے روزہ کے یکساں اوقات مقرر کر دیے جائیں۔ مثلاً سحری کھا کر سات بجے سے روزہ شروع ہوا اور شام سات بجے افطار کر لیا؟

جواب: روزہ کے سلسلہ میں ایک بات بالکل واضح ہے کہ صبح صادق کے طلوع سے روزہ شروع ہوتا ہے اور سورج غروب ہونے تک رہتا ہے۔ سرزمین عرب میں جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ۲۱ رجون سب سے طویل دن ہوتا ہے۔ اور اس دن سورج ساڑھے چار بجے طلوع ہو کر شام کو سات بجے غروب ہوتا ہے۔ سحری کا وقت اس روز صبح تین بجے تک رہتا ہے۔

اب اگر ساری دنیا کے لیے سحر و افطار کا یکساں ضابطہ مقرر کیا جائے اور ہر موسم اور ہر ملک میں صبح سات بجے سے شروع ہو کر شام چھ سات بجے ختم ہو تو اس کے دوسرے لفظوں میں یہ معنی ہونگے کہ شریعت کے اس قاعدے کو کہ اوقات سحر و افطار سورج کے طلوع و غروب کے تابع ہو، بدل کر سحر و افطار کو گھڑی کی سوئی کا پابند بنا دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ جرأت تو وہی شخص کرسکتا ہے جو خدا اور رسول کی جگہ خود شارع بن بیٹھے۔

البتہ یہ ایک واقعی اشکال ہے کہ خط استوا سے جوں جوں قطبین کی جانب بڑھتے جائیں شب و روز کا تفاوت بڑھتا چلا جاتا ہے۔ جاڑوں میں دن چھوٹے اور راتیں بڑی ہوتی ہیں اور گرمیوں میں دن بڑے اور راتیں چھوٹی ہوتی ہیں۔ اگر خط استوا کے شمالی منطقوں میں سردی کا موسم ہوتا ہے تو انہی دنوں میں خط استوا کے جنوبی علاقوں میں گرمیاں ہوتی ہیں۔ ۴۵ درجے عرض بلد تک تو یہ تفاوت قابل برداشت ہوتا ہے لیکن اس سے آگے نہیں۔ قطبین ۹۰ درجہ عرض بلد پر واقع ہیں اور یہاں چھ مہینے سورج غروب نہیں ہوتا (سوائے ایک دن کے)، گویا قطبین پر سال میں صرف تین دن ہوتے ہیں جن میں دو دن ۲۴-۲۴ گھنٹے کے اور ایک دن ہمارے ۳۶۳ دنوں کے برابر ہوتا ہے۔ ۷۲ درجہ عرض البلد پر یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ۱۷ نومبر سے ۲۴ جنوری تک مسلسل رات رہتی ہے۔ ۲۵ جنوری کو سورج ۱۲ بجکر چار منٹ پر طلوع ہوتا ہے اور اکیس منٹ کے بعد ۱۲ بجکر پچیس منٹ پر غروب ہو جاتا ہے۔ اگلے دن سورج گیارہ بجکر ۱۶ منٹ پر طلوع ہوتا ہے اور ایک بجکر گیارہ منٹ پر غروب ہو جاتا ہے۔ اور ۹ مئی سے ۴ اگست تک مسلسل سورج غروب ہی نہیں ہوتا۔ گویا اگر قطبین (یعنی ۹۰ درجہ عرض البلد) پر چھ مہینہ کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوتی ہے تو ۶۶ درجہ عرض البلد پر سال میں ایک دفعہ پندرہ دن تک سورج طلوع ہی نہیں ہوتا اور دوسری دفعہ پندرہ دن تک غروب نہیں ہوتا۔ یہ صورت حال روزہ رکھنے والوں کے لیے ناقابل برداشت ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ ان منطقوں میں جنہیں غیر معمولی منطقے کہا جاتا ہے، انسانوں کی اچھی خاصی تعداد بستی ہے، اور اس آبادی کا معتد بہ حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ مثلاً فن لینڈ میں ایک ہزار مسلمان آباد ہیں۔ اسی طرح روس کے شمالی علاقوں میں واقع کیمپوں میں ہزاروں کی تعداد

میں مسلمان مزدور کام کرتے ہیں اور اب وہ دن بھی دور نہیں کہ روسی مسلمان بھی آزادی کے ساتھ اپنے دین پر عمل کر سکیں گے۔ ایسے علاقوں میں نہ تو یہ ممکن ہے کہ ایک شخص مسلسل چودہ دن روزہ کی حالت میں گذار دے اور نہ ہی یہ مناسب ہے کہ وہ چوبیس گھنٹوں میں صرف پچیس منٹ یا دو گھنٹہ کے روزہ پر اکتفا کرے۔

ان وجوہ کی بنا پر یہ امر ناگزیر ہے کہ کرۂ زمین کو اس ضرورت کے پیش نظر معمولی اور غیر معمولی دو منطقوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ خطِ استوا سے ۴۵ درجہ شمالاً و جنوباً عرض البلد تک تو معمولی منطقہ ہو اور اس سے آگے قطبین تک دونوں جوانب غیر معمولی منطقے شمار کیے جائیں اور ان غیر معمولی منطقوں کے لیے وہی اوقاتِ سحر و افطار ہوں جو معمولی منطقے کے انتہائی اوقات سحر و افطار ہو سکتے ہیں۔

۴۵ درجہ عرض البلد کا تعین ہم اس لیے کرتے ہیں کہ پورا کرۂ ارضی خطِ استوا کے شمالاً جنوباً ۹۰ درجات عرض البلد میں منقسم ہے اور ۴۵ اس کا وسط ہے۔ اس میں کرۂ ارضی کا پورا نصف حصہ اور خشکی کا تقریباً تین چوتھائی حصہ آجاتا ہے اور دنیا کی کل آبادی کا تقریباً اسی فیصدی حصہ اسی علاقے میں رہتا ہے کیونکہ برا عظم افریقہ، عرب، ہند و پاکستان، چین، جنوب مشرقی ایشیا، ریاستہائے متحدہ امریکہ بلکہ جنوبی امریکہ تک کے تقریباً تمام علاقے اسی میں شامل ہیں۔ اس طرح ان علاقوں کے معمول میں سرے سے کوئی فرق واقع نہ ہوگا جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں یا جہاں اسلام کے نقوش و اثرات کافی گہرے اور قدیمی ہیں اس فہرست میں جو ممالک شامل ہیں ان میں دنیائے عرب، سپین، سسلی، سمرقند، بخارا، ترکی، ایران، افغانستان، انڈونیشیا، پاکستان، ہندوستان اور البانیہ خاص طور پر مشہور ہیں۔

اسے اردہ جانتے ہیں غیر معمولی منطقے جو شمال میں ۴۵ درجے سے اوپر اور جنوب میں ۴۵ درجے سے نیچے واقع ہیں، تو ہمارے بیان کردہ فارمولے کے مطابق ان کے لیے اوقاتِ سحر و افطار کا مستقل گوشوارہ یہ ہوگا۔

شمالی منطقہ طلوع	شمالی منطقہ غروب	تاریخ	جنوبی منطقہ طلوع	جنوبی منطقہ غروب
۷،۳۹	۱۶،۲۸	۱ جنوری	۴،۱۷	۱۹،۵۰
۷،۳۶	۱۶،۴۳	۱۵ "	۴،۳۱	۱۹،۴۶
۷،۲۲	۱۶،۵۶	۱ فروری	۴،۵۲	۱۹،۳۱
۷،۱۳	۱۷،۱۶	۸ "	۵،۵۵	۱۹،۲۲
۷،۵۳	۱۷،۲۶	۱۵ "	۵،۱۶	۱۹،۱۳
۶،۳۹	۱۷،۴۷	۲۲ "	۵،۲۶	۱۹،۱۵
۶،۲۶	۱۷،۵۶	یکم مارچ	۵،۳۷	۱۸،۱۴
۶،۱۴	۱۸،۵۶	۸ "	۵،۲۶	[illegible]
۶،۰۰	۱۸،۱۵	۱۵	[illegible]	۱۸،۴۲
۵،۴۳	۱۸،۲۷	۲۲ "	۶،۵۴	۱۸،۱۵
۵،۲۹	۱۸،۵۱	۱ اپریل	۶،۱۸	۱۸،۵۰
۵،۱۶	۱۸،۴۵	۸ "	۶،۲۹	۱۷،۵۰
۵،۵۴	۱۸،۵۴	۱۵ "	۶،۳۲	۱۷،۳۶
۴،۵۰	۱۹،۵۵	۲۲ "	۶،۴۴	۱۷،۲۶
۴،۴۰	۱۹،۱۴	۱ مئی	۶،۵۴	۱۷،۱۳
۴،۳۱	۱۹،۲۲	۸ "	۷،۵۲	۱۶،۵۹
۴،۲۳	۱۹،۲۹	۱۵ "	۷،۱۵	۱۶،۴۹
۴،۱۷	۱۹،۳۹	۲۲ "	۷،۱۸	۱۶،۴۲
۴،۱۳	۱۹،۴۴	۱ جون	۷،۲۸	۱۶،۳۵

۴،۱۲	۱۹،۴۸	۸ جون	۷،۳۲	۱۹،۲۸
۴،۱۳	۱۹،۵۰	۱۵ ؍	۷،۳۷	۱۹،۲۳
۴،۱۷	۱۹،۵۰	۲۲ ؍	۷،۳۹	۱۹،۲۴
۴،۲۱	۱۹،۴۸	۱ جولائی	۷،۳۹	۱۹،۲۵
۴،۲۷	۱۹،۴۴	۸ ؍	۷،۳۷	۱۹،۵۹
۴،۳۴	۱۹،۳۸	۱۵ ؍	۷،۳۳	۱۹،۳۳
۴،۴۶	۱۹،۲۷	۲۲ ؍	۷،۲۸	۱۹،۳۹
۴،۵۳	۱۹،۱۸	۱ اگست	۷،۱۷	۱۹،۴۵
۵،۵۱	۱۹،۵۷	۸ ؍	۷،۵۸	۱۹،۵۶
۵،۵۹	۱۸،۵۴	۱۵ ؍	۶،۵۸	۱۷،۵۳
۵،۲۱	۱۸،۳۸	۲۲ ؍	۶،۴۶	۱۷،۱۲
۵،۳۵	۱۸،۲۵	۱ ستمبر	۶،۳۹	۱۷،۲۱
۵،۳۸	۱۸،۱۲	۸ ؍	۶،۱۶	۱۷،۳۱
۵،۴۶	۱۷،۵۸	۱۵ ؍	۶،۵۳	۱۷،۴۰
۵،۵۷	۱۷،۴۱	۲۲ ؍	۵،۵۴	۱۷،۴۹
۶،۵۶	۱۷،۲۸	۱ اکتوبر	۵،۳۸	۱۷،۵۷
۶،۱۵	۱۷،۱۶	۸ ؍	۵،۲۱	۱۷،۵۴
۶،۱۵	۱۷،۲۸	۱۵ ؍	۵،۵۶	۱۸،۰۴
۶،۲۲	۱۷،۱۶	۲۲ ؍	۵،۵۴	۱۸،۳۵
۶،۳۸	۱۹،۴۹	۱ نومبر	۵،۳۹	۱۸،۴۸
۶،۴۰	۱۹،۳۹	۸ ؍	۵،۳۰	۱۸،۵۸

٦،٥٧	١٦،٣٢	١٥ نومبر	٥،٢٢	١٩،٥٧
٧،٥٧	١٦،٢٥	٢٢ //	١٥،٤	١٩،٠٨
٧،١٨	١٦،٢٥	١ دسمبر	٤،٥٨	١٩،٢٨
٧،٢٥	١٦،١٨	٨ //	٤،٥٧	١٩،٣٧
٧،٣١	١٦،١٩	١٥ //	٤،٥٨	١٩،٤٣
٧،٣٦	١٦،٢٢	٢٢ //	١٥،٤	١٩،٤٧

اس گوشوارہ کو ذہن میں رکھ کر درمیانی تاریخوں کے اوقات کا حساب بآسانی لگایا جا سکتا ہے سحری کا وقت سورج طلوع ہونے سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ قبل تک رہیگا۔ اسی طرح عشا کا وقت غروب آفتاب سے ڈیڑھ گھنٹہ بعد شروع ہوگا۔ نصف النہار کا وقت البتہ جاڑوں میں ۱۲ بجے اور گرمیوں میں ساڑھے بارہ بجے ہوگا اور عصر کا وقت نصف النہار اور مغرب کے درمیان یعنی اندازاً ساڑھے تین بجے سے چار بجے تک شروع ہوگا۔ اس رائے سے متعدد مسلمان ممالک کے علماء اتفاق کر چکے ہیں۔

(ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نیتی زیر مہ ارد سلامک ریڈیو لندن)